تعدّد ازدواج اور اسلام

(۴)

ایک مطالعہ

عمر احمد عثمانی

اس مضمون کی پچھلی اشاعت میں تعدد ازدواج کے سلسلہ میں قرآن کریم کی مختلف آیات کریمہ سے ہم نے یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ قرآن کریم کا اپنا رجحان تعدد ازدواج کی طرف نہیں بلکہ وحدت ازدواج ہی کی طرف ہے اور اس لئے یہ بات جو مشہور ہوگئی ہے کہ اسلام تعدد ازدواج کا حامی ہے اور اس کے نزدیک ہر شخص کو عام حالات میں بھی کئی کئی شادیاں کرنے کا حق حاصل ہے ایک ایسی تہمت ہے جس کا قرآن کریم متحمل نہیں ہے۔ اسی سلسلہ میں ہم نے سورۂ نساء کی مشہور آیت (۳) یعنی وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ (اور اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ تم یتامیٰ کے ساتھ انصاف کا سلوک نہیں کرسکو گے تو ان میں سے جو عورتیں تمہارے لئے پاکیزہ (حلال) اور پسندیدہ ہوں، تم ان سے نکاح کرلو، دو دو، تین تین، چار چار) پر بحث کرتے ہوئے بتایا تھا کہ یہ آیت کریمہ مسلمانوں کے عام حالات سے تعلق نہیں رکھتی، جیسا کہ عموماً سمجھ لیا گیا ہے۔ بلکہ اس آیت کا تعلق مسلم معاشرہ کے ان خصوصی حالات سے ہے جبکہ تعدد ازدواج کے بغیر یتیم اور بیوہ عورتوں کے ساتھ سماجی اور معاشرتی انصاف کا سلوک نہ کیا جا سکتا ہو اور ان کا تحفظ نہ ہو سکنے کی وجہ سے ان کے تباہ حال اور ضائع ہو جانے کا اندیشہ لاحق ہو۔ ہم نے عرض کیا تھا کہ آیت کا سیاق و سباق یہ بتا رہا ہے کہ اس

سلسلہ کی مذکورہ ہدایات یتامیٰ سے متعلق ہیں اور اسی سلسلۂ کلام میں یہ آیت بھی آئی ہے حتیٰ کہ اس آیت کریمہ کی ابتدا بھی خود یتامیٰ ہی کے تذکرہ سے ہوئی ہے اور اس میں تعدد ازدواج کی اجازت کو بھی اس شرط کے ساتھ مشروط فرمایا گیا ہے کہ اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ یتامیٰ کے ساتھ تعدد ازدواج کے بغیر سماجی اور معاشرتی انصاف کا سلوک نہیں ہو سکے گا، انہیں مناسب تحفظ حاصل نہیں ہو سکے گا. ان کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ لاحق رہے گا تو تمہیں ان میں سے یتیم اور بیوہ عورتوں کے ساتھ دو دو، تین تین، چار چار کی تعداد میں نکاح کر لینے کی اجازت ہے کہ اس طرح وہ تمہارے اپنے گھر اور خاندان کا فرد بن جائینگی اور ان کی نگہداشت اور خبرگیری کرنا محض ایک اخلاقی اور دینی فریضہ ہی نہیں رہے گا بلکہ ایک خانگی اور خاندانی ضرورت بھی بن جائے گا. اگر جنگ وغیرہ کی وجہ سے معاشرہ میں ایسی عورتوں کی تعداد بڑھ گئی ہو تو اس کا حل بھی نکل آئے گا۔ اور یوں یہ یتیم اور بیوہ عورتیں خود اپنے معاشرہ ہی میں کھپ سکیں گی.

بہرحال اس آیت کا مقصد ایسے حالات میں تعدد ازدواج کی اجازت دینا ہے جبکہ اس کا منشا یتیم اور بیوہ عورتوں کو سماجی اور معاشرتی تحفظ عطا کرنا ہو. یتامیٰ کے معنی عربی زبان میں محض چھوٹے چھوٹے بے باپ کے بچوں ہی کے نہیں ہوتے جیسا کہ ہمارے ہاں سمجھ لیا گیا ہے بلکہ یتامیٰ سے مراد بن باپ کی ناکتخدا بالغ لڑکیاں اور بیوہ عورتیں بھی ہوتی ہیں اور وہی اس آیت میں مراد ہیں۔ اس کے بعد ہم نے وعدہ کیا تھا کہ ہم اس مضمون کی دوسری قسط میں یہ سمجھانے کی کوشش کریں گے کہ عربی زبان میں یتامیٰ سے مراد اسی قسم کی عورتیں کیوں ہیں جو باپ یا شوہر کا سایہ سر سے اُٹھ جانے کی وجہ سے اس بھری دنیا میں بے سہارا اور بے آسرا رہ گئی ہوں؟ اس سلسلہ میں عربی زبان کے مشہور امام لغت علامہ محب الدین ابوالفیض سید مرتضیٰ حسینی زبیدی رح کی تصریحات قابل غور ہیں علامہ موصوف فرماتے ہیں کہ

وقال ابوسعید یقال للمرأۃ یتیمۃ لایزول عنھا اسم الیتم ابدا۔ وانشدوا ؎ وینکح الارامل الیتامیٰ	ابوسعید نے کہا ہے کہ عورت کو ہمیشہ یتیمہ کہا جاتا ہے اور اس سے یتیمی کا لقب کسی وقت بھی جدا نہیں ہوتا اس کے ثبوت میں علمائے لغت یہ مصرعہ پیش کرتے ہیں ؎ "وینکح الارامل الیتامیٰ" (اور وہ بیوہ اور یتیم عورتوں سے نکاح کرتا ہے)
وقال ابوعبیدۃ : تدعیٰ یتیمۃ مالم تتزوج فاذا	ابوعبیدہ نے کہا ہے کہ عورت کو اس وقت تک یتیمہ کہہ کر

تزوجت زال عنها اسم الیتم ۔ وکان المفضل ینشد ے

پکارا جاتا ہے جب تک اس کی شادی نہ ہوجائے پھر جب اس کی شادی ہوجائے تو یتیمی کا لقب اس کے لئے باقی نہیں رہتا ۔ اس کے ثبوت میں مفضل یہ شعر پیش کیا کرتے تھے ۔

افاطم انی ھالک فتثبتی

ولاتجزعی کل النساء یتیم

"اے فاطمہ ! میں مر رہا ہوں ۔ لہٰذا تم صبر و ضبط سے کام لینا اور گریہ و زاری نہ کرنا ۔ عورتیں تو سب کی سب یتیم ہی ہوا کرتی ہیں"

...... وفی الحدیث تستأمر الیتیمۃ فی نفسھا فان سکتت فھواذنھا ۔ اراد بالیتیمۃ البکر البالغۃ التی مات ابوھا قبل بلوغھا فلزمھا اسم الیتم فدعیت بہ وھی بالغۃ ۔ وفی حدیث الشعبی ان امرأۃ جاءت الیہ فقالت انی امرأۃ یتیمۃ فضحک اصحابہ فقال النساء کلھن یتامیٰ ای ضعائف ...... وجاء فی حدیث عمر رضی اللّٰہ عنہ قالت لہٗ بنت خفاف الغفاری انی امرأۃ مؤتمۃ توفی زوجی

[تاج العروس من جواہر القاموس ج ۹ ص۱۱۳ مطبوعہ مطبعۂ خیریہ جمالیہ مصر ۱۳۰۶ھ]

...... حدیث میں آیا ہے کہ "یتیم لڑکی سے (اس کے نکاح کے وقت) اس کی مرضی معلوم کی جائیگی ۔ پھر اگر وہ خاموش رہے تو اس کی خاموشی کو رضامندی سمجھا جائیگا" یہاں یتیمہ سے مراد کنواری جوان لڑکی ہے جس کے والد کا انتقال ہوچکا ہو چنانچہ یتیمی کا نام اس کے ساتھ برابر لگا رہا حتی کہ جوان ہوجانے کے بعد بھی اس کو حدیث میں یتیمہ ہی فرمایا گیا ہے ۔ علاوہ ازیں شعبی کی ایک حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک عورت حاضر ہوئی اور انہوں نے عرض کیا کہ "میں ایک یتیم عورت ہوں" تو اس پر آپ کے اصحاب کو ہنسی آگئی (کہ اتنی بڑی عورت ہوکر وہ اپنے آپ کو یتیم کہہ رہی ہے) تو آپ نے فرمایا کہ عورتیں سب کی سب یتیم ہوتی ہیں ۔ آپ کا اس سے مطلب تھا کہ وہ سب کی سب کمزور ہوتی ہیں ...... حضرت عمرؓ کی حدیث میں آیا ہے کہ خفاف غفاری کی لڑکی نے آپ سے عرض کیا تھا کہ میں ایک یتیم عورت ہوں ۔ میرا شوہر مرگیا ہے ۔

نیز امام علامہ ابوالفضل جمال الدین محمد بن مکرم بن منظور افریقی (المتوفی ۷۱۱ھ) اپنی مشہور لغت لسان العرب میں مندرجہ بالا تصریحات درج کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ

مواصل الیتم بالضم والفتح الانفراد وقیل الغفلۃ والانثی یتیمۃ واذا بلغا زال

"یُتْم" بہ ضمۂ یاء و فتحہ ، کے اصل معنی اکیلا ہونے کے ہیں ۔ دوسرا قول یہ بھی ہے کہ اس کے اصل معنی غفلت کے ہیں ۔

عنها اسم اليتم حقيقة وقد يطلق عليهما مجازا بعد البلوغ كما كانوا يسمون النبي صلى الله عليه وسلم وهو كبير يتيم ابي طالب لانه رباه بعد وفات ابيه وفي الحديث تستأمر اليتيمة في نفسها فان سكتت فهو اذنها اراد باليتيمة البكر البالغة التي مات ابوها قبل بلوغها فلزمها اسم اليتم فدعيت به وهي بالغة مجازاً

لسان العرب ج ۱۶ ص ۱۳۲-۱۳۳

(مطبوعہ مطبعۂ کبریٰ میریہ بولاق مصر سنہ ۱۳۰۰ھ)

عورت کو "یتیمہ" کہتے ہیں۔ مرد و عورت جب بالغ ہو جائیں تو حقیقی معنی کے اعتبار سے ان سے یتیمی کا لقب دور ہو جاتا ہے لیکن مجازاً ان دونوں کو بلوغ کے بعد بھی یتیم کہا جاتا ہے جیسا کہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑا ہو جانے کے بعد بھی "یتیم ابی طالب" کہا کرتے تھے کیونکہ ابو طالب نے آپ کے والد کے انتقال کے بعد آپ کی پرورش کی تھی۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ یتیم عورت سے اس کے نفس کے (نکاح کے) بارے میں اس کی مرضی معلوم کی جائے پھر اگر وہ خاموش رہے تو اسے اس کی اجازت سمجھا جائے۔ اس حدیث میں یتیمہ سے مراد کنواری بالغ لڑکی ہے جس کا باپ اس کے بالغ ہونے سے پہلے مرگیا ہو، پھر یتیمی کا لقب اس کے ساتھ لگا رہا اور بالغ ہونے کے بعد بھی مجازاً اسے یتیمہ ہی کہہ کر پکارا گیا ہے۔

یتیم کے یہ معنے محض لغوی ہی نہیں ہیں جسے علمائے لغت ہی نے بیان فرمایا ہو بلکہ یہ ایسے معنے ہیں جسے ہمارے اکابر فقہاء نے بھی تسلیم کیا ہے چنانچہ حجۃ الاسلام امام ابوبکر احمد بن علی رازی جصاص حنفی متوفی سنہ ۳۷۰ھ فرماتے ہیں۔

وقد روى يزيد ابن هرمز ان نجدة كتب الى ابن عباس يسئله عن اليتيم متى ينقطع يتمه فكتب اليه اذا اونس منه الرشد انقطع عنه يتمه وفي بعض الالفاظ ان الرجل ليقبض على لحيته ولم ينقطع عنه يتمه بعد فاخبر ابن عباس ان اسم اليتيم قد يلزمه بعد البلوغ اذا لم يستحكم رأيه ولم يؤنس منه رشد فجعل بقاء

یزید ابن ہرمز نے روایت کی ہے کہ نجدہ نے حضرت ابن عباس رضؓ سے لکھ کر دریافت کیا تھا کہ یتیم سے یتیمی کا نام کب ختم ہو جاتا ہے تو ابن عباس رضؓ نے نجدہ کو جواب میں لکھا تھا کہ جب اس سے رُشد (معاملات کی سوجھ بوجھ) محسوس ہونے لگے تو پھر اس کو یتیم نہیں کہیں گے۔ اور بعض روایات میں یہ الفاظ ہیں کہ آدمی کی ڈاڑھی ایک مٹھی کے برابر ہو جاتی ہے مگر اس سے یتیمی کا لقب دور نہیں ہوتا۔ تو اس روایت میں حضرت ابن عباس رضؓ نے بتایا ہے کہ بالغ ہونے کے بعد

ضعف الرأی موجبا لبقاء اسم
الیتیم علیه واسم الیتیمة قد یقع
علی المنفرد عن ابیه وعلی المرأة
المنفردة عن زوجها. قال النبی صلی الله
علیه وسلم تستأمر الیتیمة فی
نفسها وهی لا تستأمر الا وهی
بالغة وقال الشاعر

ان القبور تنکح الایامی
النسوة الارامل الیتامی

الا انه معلوم انه اذا صار شیخا
او کهلا لا یسمی یتیما وان کان ضعیف
العقل ناقص الرأی فلابد من
قرب العهد بالصغر والمرأة الکبیرة
المسنة تسمی یتیمة من جهة انفرادها
عن زوج والرجل الکبیر المسن لا یسمی
یتیما من جهة انفراده عن ابیه و
انما کان کذلک لان الاب یلی علی الصغیر
ویدبر امره ویحوطه فیکنفه فسمی الصغیر
یتیما لانفراده عن ابیه الذی هذه حاله
فما دام علی حال الضعف ونقصان الرأی
یسمی یتیما بعد البلوغ واما المرأة فانها

بھی اگر آدمی کی رائے میں استحکام پیدا نہ ہو اور معاملات
کی سوجھ بوجھ کا اندازہ نہ ہو سکے تو ایسے آدمی پر یتیمی کا لقب
برابر برقرار رہتا ہے لہذا ابن عباس رضؓ نے ضعف رائے
کے باقی رہنے کو یتیمی کے لقب کے برقرار رہنے کا موجب
قرار دیا ہے۔ یتیم کا لفظ اس آدمی پر بھی بولا جاتا ہے جو اپنے
باپ سے الگ رہ گیا ہو اور اس عورت پر بھی بولا جاتا ہے جو
اپنے شوہر سے الگ رہ گئی ہو۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا ہے کہ یتیم لڑکی سے اس کے اپنے نفس کے بارے
میں (نکاح کے وقت) مرضی معلوم کی جائے۔ اور یتیم
لڑکی سے اس کی مرضی اسی وقت معلوم کی جا سکتی ہے جبکہ
وہ بالغ ہو چکی ہو۔ شاعر نے کہا ہے ؎

درحقیقت قبریں ہی بیواؤں یعنی بے سہارا یتیم عورتوں کا
نکاح کراتی ہیں کہ ان کے شوہر فوت ہو کر قبروں میں پہنچ جاتے
ہیں اور ان کا قبروں میں پہنچ جانا ان عورتوں کے دوسرے
نکاح کا سبب بن جاتا ہے (شاعر نے اس شعر میں بیوہ،
جوان عورتوں کو یتامی کہا ہے، لیکن یہ بات معلوم ہے کہ مرد
جب بوڑھا یا ادھیڑ ہو جاتا ہے تو اسے یتیم نہیں کہتے خواہ
وہ کتنا ہی ضعیف العقل اور ناقص الرائے کیوں نہ ہو۔
لہذا مرد کے سلسلہ میں اس کا بچپن کی عمر سے قریب العہد ہونا
یتیم کہلانے کے لئے ضروری ہے لیکن بڑی بوڑھی سن رسیدہ
عورت کو یتیمہ اس اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ وہ شوہر سے
الگ رہ گئی ہے جبکہ بڑے بوڑھے سن رسیدہ مرد کو اس
اعتبار سے یتیم نہیں کہا جاتا کہ وہ اپنے باپ سے الگ رہ

سميت يتيمة لانفرادها عن الزوج الذی هی فی حباله وکنفه نهی وان کبرت ذهذا الاسم لازم لها لان وجود الزوج لها فی هذه الحال بمنزلة الاب للصغير فی انه هو الذی يلی حفظها وحياطتها فاذا انفردت عمن هذه حاله معها سميت يتيمة کما سمی الصغير يتيما لانفراده عمن يلی برامره ويکنفه ويحفظه الا تری الی قوله تعالیٰ "اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَی النِّسَاءِ" کما قال : وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰی بِالْقِسْطِ فجعل الرجل قيما علی امرأته کما جعل ولی اليتيم قيما عليه

(احکام القرآن ص۵۷-۵۸ ج ۲
مطبوعہ مطبعہ بہیہ مصریہ - ۱۳۴۷ھ ہجریہ)

گیا ہے۔ اس لئے ہے کہ باپ عموماً چھوٹے بچے کا ولی ہوتا ہے۔ وہی اس کے معاملات کا انتظام کرتا اور اس کی حفاظت وصیانت کا فرض انجام دیتا ہے۔ لہٰذا چھوٹے بچہ کو یتیم کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اپنے اس باپ سے الگ رہ گیا ہے جس کی صورت یہ تھی۔ پھر یہ بچہ جب تک حالت ضعف اور نقصان عقل و رائے پر بالغ ہونے کے بعد بھی قائم رہے اُسے یتیم ہی کہا جائیگا۔ لیکن عورت کو اس لئے یتیمہ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے اس شوہر سے الگ رہ جاتی ہے جس کے وہ نکاح اور حفاظت میں تھی۔ لہٰذا بڑی ہو جانے کے بعد بھی یہ لقب برابر اس کے ساتھ لگا رہتا ہے۔ کیونکہ اس حالت میں شوہر کا وجود بعینہٖ ویسا ہی ہے جیسا کہ چھوٹے بچہ کے لئے اس کے باپ کا وجود ہوا کرتا ہے کیونکہ شوہر ہی عورت کی حفاظت وصیانت کا ذمہ دار ہوتا ہے لہٰذا جب وہ اپنے شوہر سے الگ رہ جائے جس کی صورت یہ کچھ تھی تو عورت کو یتیمہ کہا جائیگا جیسا کہ چھوٹے بچہ کو اس وجہ سے یتیم کہا جاتا تھا کہ وہ اس ہستی سے الگ رہ گیا ہے جو اس کے معاملات کا انتظام کرتی اور اس کی حفاظت وصیانت کا فرض دیتی تھی۔ ملاحظہ فرمایئے کہ حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں مردوں کو عورتوں کا کفیل اور نگران بتایا ہے جیسا کہ دوسری جگہ لوگوں کو حکم دیا ہے کہ وہ یتیموں کی کفالت اور نگرانی انصاف کے ساتھ کریں۔ تو جس طرح یتیم کے ولی کو یتیم کا کفیل و نگران [illegible]

اپنی بیوی کا کفیل اور نگراں بتایا ہے۔

علمائے لغت اور اکابرین فقہ کی تصریحات سے ظاہر ہے کہ یَتَامٰی کے مفہوم میں وہ جوان اور غیر شادی شدہ لڑکیاں جن کے باپ مر گئے ہوں اور وہ لڑکیاں جن کے باپ اور شوہر اس دنیا میں موجود نہ رہے ہوں سب ہی شامل ہیں۔ اسی کی وضاحت سورۂ نساء کی ایک دوسری آیت سے بھی ہو جاتی ہے جس میں خود اسی آیت کا حوالہ دیا گیا ہے اور وہاں صرف یَتَامٰی کا لفظ استعمال نہیں فرمایا گیا ہے بلکہ یَتَامَی النِّسَاءِ کا لفظ استعمال فرمایا گیا ہے اور بتا دیا گیا ہے کہ سورۂ نساء کی اس آیت میں بھی یَتَامٰی سے مراد یتیم عورتیں (یتیم جوان نا کتخدا اور بیوہ لڑکیاں) ہی ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ

وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَاءِ ۖ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ وَمَا يُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ فِي يَتَامَى النِّسَاءِ اللَّاتِي لَا تُؤْتُونَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُونَ أَن تَنكِحُوهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الْوِلْدَانِ وَأَن تَقُومُوا لِلْيَتَامَىٰ بِالْقِسْطِ ۚ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِهِ عَلِيمًا ۝ (۴/۱۲۷)

اور (اے پیغمبر اسلام) لوگ آپ سے عورتوں کے بارے میں خدا کا حکم دریافت کرتے ہیں آپ ان سے کہہ دیجئے کہ خدا تمہیں عورتوں کے بارے میں (عدل و قسط کا) حکم دیتا ہے اور وہ آیت بھی جو یتیم عورتوں اور کمزور بچوں کے بارے میں اکتساب (قرآن کریم) میں تم پر تلاوت کی جاتی ہے (یعنی آیت ۳) (عدل و قسط ہی کا) حکم دیتی ہے۔ وہ یتیم عورتیں جنہیں تم وہ مہر کی مقدار تو ادا نہیں کرتے جو ان کے لئے مقرر کیا گیا تھا اور ان سے نکاح کرنے کی خواہش رکھتے ہو اور (خدا یہ حکم دیتا ہے کہ) سب یتیموں کے ساتھ انصاف پر قائم رہو۔ اور جو کچھ بھلائی تم کرو گے تو (وہ ضائع نہیں جائیگی) یقیناً خدا اُسے جاننے والا ہے۔

اس آیت کریمہ میں وَمَا يُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ فِي يَتَامَى النِّسَاءِ (اور وہ آیت جو یتیم عورتوں کے بارے میں اکتساب میں تم پر تلاوت کی جاتی ہے) سے اشارہ اسی آیت کی طرف ہے جو یہاں زیر بحث ہے اس کی تصریح خود حضرت عائشہ رضؓ کی اس روایت میں موجود ہے جو سورۂ نساء کی آیت نمبر ۳ کے شان نزول کے سلسلہ میں پیش کی جاتی ہے اور جس پر آگے بحث کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں قرآن کریم میں اور کوئی دوسری آیت موجود نہیں ہے جس میں ان یتیم عورتوں کے متعلق کوئی حکم دیا گیا ہو۔ اس آیت کریمہ

میں وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ کا عطف بھی فِي يَتَامَى النِّسَاءِ ہی پر ہے۔ جس سے معلوم ہو گیا کہ سورۂ نساء کی آیت نمبر ۳ یعنی آیت زیر بحث میں يَتَامَى کا لفظ کمزور بچوں اور یتیم عورتوں (کنواری، جوان، بے باپ کی لڑکیوں اور بیوہ عورتوں) سب کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اَلْقُرْاٰنُ يُفَسِّرُ بَعْضُهٗ بَعْضًا (قرآن کی بعض آیات دوسری قرآنی آیات کی تفسیر کر دیتی ہیں) مفسرین کا مسلمہ اصول ہے چنانچہ آپ نے اس مثال میں ملاحظہ فرما لیا ہے کہ آیت نمبر ۱۲۷ نے کس طرح آیت نمبر ۳ کی تشریح فرمائی ہے۔

علاوہ ازیں خود آیت نمبر ۳ میں بھی اس طرف اشارہ موجود ہے کہ يَتَامَى سے قرآن کی وہاں کیا مراد ہے۔ آیت میں جن عورتوں اور لڑکیوں کو اَلْيَتَامَى کے لفظ سے تعبیر کیا گیا تھا انہی کو آگے چل کر النِّسَاء کہا گیا ہے (وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ) النِّسَاء پر الف ولام لانے سے مقصد ہی یہ ہے کہ ان عورتوں کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے جن کا تذکرہ يَتَامَى کے ضمن میں پہلے آچکا ہے۔ مناسب ہوگا کہ اس کی توضیح ایک کوئی مثال سے کر دی جائے جس میں اسی ہیئت ترکیبی (Construction) کو اختیار فرمایا گیا ہے۔ رمضان کے روزوں کے سلسلہ میں سورۂ بقرہ میں فرمایا گیا ہے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۭ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰي سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ (۲/۱۸۵)

رمضان کا مہینہ جس میں قرآن کو نازل کیا گیا ہے، لوگوں کے لئے ہدایت اور ہدایت کی واضح اور تمیز کن آیات پر مشتمل ہے۔ لہٰذا تم میں سے جو شخص اس مہینہ (مذکورہ) میں اپنے گھر پر ہو وہ اس کے روزے رکھے اور جو شخص مریض یا مسافر ہو تو وہ دوسرے دنوں سے اس کی گنتی پوری کر دے۔

اس آیت میں دیکھئے الشھر میں الف ولام لایا گیا ہے لہٰذا اس سے مراد وہی مہینہ رمضان ہوگا جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ کوئی دوسرا مہینہ مراد نہیں ہو سکتا جس کی وجہ صرف یہی ہے کہ الشھر پر الف ولام اس مہینہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو متعین ہے اور پہلے مذکور ہو چکا ہے۔ لیکن اس کے بعد جب رمضان کے دنوں کی گنتی دوسرے دنوں سے پوری کرنے کا حکم دیا گیا ہے تو چونکہ ان دوسرے دنوں کا پہلے ذکر نہیں آیا تھا اور وہ متعین نہیں تھے اس لئے من الایام (الف ولام کے ساتھ) نہیں کیا گیا بلکہ من اَيَّامٍ

کہا گیا ہے اور ساتھ ہی اُخریٰ کی قید بھی لگا دی گئی ہے۔ بعینہٖ اسی طرح اگر آیت زیر بحث میں یتیم اور بیوہ عورتوں کے علاوہ کوئی دوسری عورتیں مراد ہوتیں تو النِّسَاءِ (الف ولام کے ساتھ) نہ کہا جاتا بلکہ نِسَاءٍ کہا جاتا اور اس کے ساتھ اُخریٰ کی قید بھی لگائی جاتی۔ لہٰذا اگر آیت نمبر ۱۲۷ سے یہ توضیح نہ کر دی گئی ہوتی کہ آیت نمبر ۳ میں یَتَامٰی سے مراد جوان (کنواری) اور بیوہ عورتیں ہیں تو خود آیت نمبر ۳ کی ہیئت ترکیبی بھی یہ بتانے کے لئے کافی تھی کہ یَتَامٰی سے قرآن کی کیا مراد ہے۔

یَتَامٰی کے لفظ کا یہ مفہوم عہد نبوی میں عام طور پر شائع و ذائع تھا چنانچہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس لفظ کو اسی مفہوم میں بارہا استعمال فرمایا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی مشہور روایت ہے کہ

قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الثیب احق بنفسھا من ولیھا والبکر تستأذن فی نفسھا واذنھا صماتھا (رواہ الجماعۃ الا البخاری)

ابن عباس فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بیوہ عورت اپنے ولی کے مقابلے میں اپنے نفس کی زیادہ حقدار ہے اور کنواری لڑکی سے بھی اس کے نفس کے بارے میں اس کی مرضی معلوم کی جائیگی اور اس کی خاموشی کو اس کی اجازت سمجھا جائیگا۔

اس روایت میں جیسا کہ آپ نے فرمایا ہے عام بیوہ اور کنواری لڑکیوں کے نکاح کے سلسلہ میں ہدایت دی گئی ہے چنانچہ فرمایا گیا ہے کہ بیوہ لڑکی کی شادی اس کی مرضی معلوم کئے بغیر نہیں کی جا سکتی۔ اس کے ولی کو اس کا حق نہیں ہے کہ وہ جہاں چاہے اس کی شادی کر دے۔ یہی حال بالغ کنواری لڑکی کا بھی ہے۔ البتہ بالغ کنواری لڑکی کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ زبان سے اپنی مرضی کا اظہار کرے۔ اگر ولی کے دریافت کرنے پر وہ خاموش رہے اور انکار نہ کرے تو اس خاموشی کو اس کی رضامندی سمجھا جائے گا۔ واضح رہے کہ ہمارے فقہاء نے اس کی تصریح فرمائی ہے کہ لڑکی کی خاموشی کو رضامندی اسی وقت سمجھا جائے گا جبکہ اجازت لینے والا لڑکی کا باپ ہو۔ اگر لڑکی کا باپ نہ ہو بلکہ کوئی اور ولی (چچا وغیرہ) ہو تو اس صورت میں اس کی خاموشی کو رضامندی نہیں سمجھا جائے گا۔ یعنی ان کے نزدیک کنواری لڑکی سے مراد ایسی جوان کنواری لڑکی ہے جس کا باپ بھی موجود ہے۔ لیکن بعینہٖ اسی روایت کو مسند احمد اور سنن نسائی میں ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

وَالْیَتِیْمَۃُ تُسْتَأْذَنُ فِیْ نَفْسِھَا (احمد ونسائی)

اور یتیم لڑکی سے اس کے نفس کے بارے میں اس کی مرضی معلوم ہو جائیگی۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ عہد نبوی صلعم میں یتیمۃ کے معنی وہی سمجھے جاتے تھے جو بکر کے معنی تھے۔ دونوں لفظوں کے معنوں میں کوئی فرق نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ورنہ ایک لفظ کی جگہ یوں دوسرا لفظ استعمال نہ کیا جاتا۔ ویسے ہمارے فقہائے کرام کے نزدیک بھی اس روایت میں یتیمۃ سے مراد، جوان کنواری لڑکی ہے جس کا باپ موجود ہو۔ کیونکہ سنن ابوداؤد اور سنن نسائی میں یہی روایت ان الفاظ کے ساتھ بھی آئی ہے۔

ليس للولي مع الثيب امرٌ واليتيمة تستأمر، وصمتها اقرارها
(ابوداؤد ونسائی)

بیوہ لڑکی کے ساتھ اس کے ولی کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے اور یتیم لڑکی سے بھی اس کی مرضی معلوم کی جائیگی۔ اور اس کی خاموشی کو اس کا اقرار سمجھا جائیگا۔

اور ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ ہمارے فقہا کے نزدیک جوان کنواری لڑکی کی خاموشی کو اقرار اسی وقت سمجھا جاتا ہے جبکہ اجازت لینے والا اس لڑکی کا باپ ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ حدیث میں ایسی لڑکی کو یتیمۃ فرمایا گیا ہے جو جوان ہے، کنواری ہے، اور اس کا باپ بھی زندہ ہے۔ یعنی وہی بات جو علمائے لغت نے کہی تھی کہ ہر عورت کو عرفی معنوں میں یتیم نہ ہونے کے باوجود بھی عربی زبان میں یتیمۃ کہدیا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

ان النبي صلى الله عليه وسلم قال تستأمر اليتيمة في نفسها فان سكتت فقد اذنت وان ابت لم تكره
(رواه احمد)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یتیم لڑکی سے اس کے نفس کے بارے میں اس کی مرضی معلوم کی جائیگی۔ پھر اگر وہ خاموش رہی تو اس نے اجازت دیدی اور اگر اس نے انکار کردیا تو اسے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

اس روایت میں بھی یتیمہ سے مراد جوان کنواری لڑکی ہے جس کا باپ بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم تستأمر اليتيمة في نفسها فان سكتت فهو اذنها وان ابت فلا جواز عليها
(رواه الخمسة الا ابن ماجه)(۱)

ابوہریرہ رضہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یتیم لڑکی سے اس کے نفس کے بارے میں اس کی مرضی معلوم کی جائیگی۔ پھر اگر وہ خاموش رہے تو یہ اس کی اجازت ہے، اور اگر وہ انکار کردے تو اس پر جبر کرنے کا کسی کو کوئی حق نہیں۔

---

(۱) ان تمام روایات کے لئے دیکھئے نیل الاوطار للشوکانی صفحہ ۱۰۳، ۱۰۴ ج ۶ مطبوعہ مطبعہ مصطفیٰ البابی الحلبی و اولادہ بمصر ۱۳۴۴ھ

نہیں ہے (بخاری۔مسلم۔ابوداؤد۔ترمذی۔نسائی)

اس روایت میں بھی یتیمہ سے مراد جوان کنواری لڑکی ہے جس کا باپ بھی موجود ہے۔ان تمام روایات سے ثابت ہے کہ عہد نبوی میں یتیمہ کا لفظ جوان کنواری لڑکیوں کے لئے عام طور پر بولا جاتا تھا اور یہ لفظ بڑی حد تک بکرؔ کا مرادف سمجھا جاتا تھا۔حتیٰ کہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس لفظ کو اسی مفہوم میں استعمال فرمایا کرتے تھے۔ان تمام روایات سے علمائے لغت کے اس قول کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ عربوں میں ہر عورت کو یتیمہ کہدیا جاتا تھا حتیٰ کہ ان عورتوں کو بھی جو عرفی معنوں میں یتیم نہ ہوں۔اس پوری تفصیل کے بعد غالباً سمجھ میں آگیا ہوگا کہ آیت مذکورہ کا مفہوم یہ ہے کہ اگر معاشرہ میں چھوٹے چھوٹے یتیم بچوں اور بچیوں کے علاوہ ناکتخدا جوان لڑکیاں اور بیوہ عورتیں بھی اس انداز سے پائی جائیں کہ بجز اس صورت کے کہ ان میں سے جن لڑکیوں اور عورتوں سے تم شادی کر کے انھیں اپنے خاندان کا جزو بنا سکتے ہو بنا لو کسی اور طرح ان کے ساتھ سماجی و معاشرتی عدل و انصاف کا سلوک ہی نہ ہو سکتا ہو تو تمہیں اس کی اجازت ہے کہ ان عورتوں اور لڑکیوں میں سے جو تمہیں پسند ہوں اور جن سے تم شادی کر سکتے ہو یعنی وہ تمہارے لئے حلال ہوں تو تم ان سے شادیاں کر لو۔یہ شادیاں دو دو۔تین تین۔چار چار کی تعداد میں بھی کی جا سکتی ہیں۔بشرطیکہ ان متعدد بیویوں کے ساتھ تم برابری کا سلوک کر سکو اور کسی کی حق تلفی نہ کرو۔لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم ان کے ساتھ برابری کا سلوک نہیں کر سکو گے تو پھر تعدد ازدواج کی اجازت نہیں ہے۔ایسی صورت میں تمہیں ایک ہی بیوی یا کنیز پر اکتفاء کرنا چاہیئے۔

ایسی صورت بعض ہنگامی حالات میں بھی پیدا ہو سکتے ہیں کہ مثلاً جنگ وغیرہ کی وجہ سے سوسائٹی میں مردوں کی تعداد کم ہو گئی ہو اور عورتوں کی تعداد بڑھ گئی ہو اور یتیم اور بیوہ عورتیں بے سہارا رہ گئی ہوں۔اس قسم کی صورتیں جنگجو اقوام و قبائل میں ہمیشہ پیدا ہوتی رہتی ہیں۔اور کون نہیں جانتا کہ عرب معاشرہ اپنی جنگجوئی کی وجہ سے انہی حالات سے دوچار تھا اور اسلام کے بعد ان حالات میں مزید شدت پیدا ہو گئی تھی۔اور یہ بھی ممکن ہے کہ معاشرہ میں اس قسم کے عام حالات تو نہ ہوں لیکن بعض خاندانوں میں خصوصی طور پر ایسی صورتیں پیش آسکتی ہیں جہاں یتیم اور بیوہ عورتوں کی پرورش و حفاظت کے لئے تعدد ازدواج ناگزیر ہو۔مثال کے طور پر زید کا بھائی عمرو فوت ہو جاتا ہے اور وہ اپنے پیچھے جوان بیوی اور چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ جاتا ہے۔بچوں کی پرورش اور عزو پرداخت کا تقاضا ہے کہ عمرو کی بیوی دوسری شادی نہ کرے لیکن خود

اس کی عمر اور جوانی کا تقاضا ہے کہ وہ دوسری شادی کرے۔ زید محسوس کرتا ہے کہ چچا ہونے کی حیثیت سے عمرو کے بچوں کی کفالت اس کے ذمہ ہے اور وہی ان کی پرورش اور غور و پرداخت کا ذمہ دار ہے لیکن زید کی بیوی ان بچوں کی پرورش اور نگہداشت اس انداز سے نہیں کر سکتی جس انداز سے خود بچوں کی ماں کر سکتی ہے۔ اگر عمرو کی بیوی نے دوسری شادی کر لی جس کا اسے حق ہے۔ اور اپنی عمر کے تقاضہ سے مجبور ہو کر اسے کر لینی چاہئے تو بچوں کی مٹی خراب ہو جائیگی ایسی صورت میں اگر وہ خود اپنی بھاوج سے شادی کر لے تاکہ بچوں کی پرورش اور نگہداشت مناسب طریقہ پر ہو سکے تو قرآن کریم کی اس آیت کریمہ کی رو سے ایسی صورت میں زید کو دوسری شادی کر لینے کا حق ہے اور اس پر کوئی بندش نہیں ہے۔ بہرحال یتیموں اور بیواؤں کی حفاظت و نگہداشت کے ارادہ سے اگر ایک سے زیادہ شادیاں کی جائیں تو قرآن کریم کی رو سے اس کی اجازت ہے۔ اس کے علاوہ اور کسی مقصد یا ارادہ سے عقد ثانی کی اجازت قرآن کریم نے نہیں دی۔

آیت کی مروجہ تفسیر

قرآن کریم کی رو سے بات اس قدر واضح ہے کہ اس میں کسی قسم کی کوئی پیچیدگی نہیں ہے لیکن ہمارے مفسرین و مترجمین نے اس آیت کا وہ مطلب نہیں لیا جو ہم نے بیان کیا ہے اور اسی وجہ سے بڑی پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں یہاں نمونے کے طور پر ہم مولانا ابوالکلام آزاد کا ترجمہ اور تفسیر نقل کرتے ہیں۔ باقی تمام مفسرین و مترجمین نے بھی اسی انداز کے ترجمے اور تفسیریں فرمائی ہیں۔ مولانا آزاد اس آیت کا ترجمہ اس طرح فرماتے ہیں کہ

> اور (دیکھو) اگر (تم نکاح کرنا چاہو اور) تمہیں اندیشہ ہو کہ یتیم لڑکیوں کے معاملہ میں انصاف نہ کر سکو گے تو (انھیں اپنے نکاح میں نہ لاؤ بلکہ) جو عورتیں تمہیں پسند آئیں، ان سے نکاح کر لو (یعنی دوسری عورتوں میں سے جو تمہیں پسند آئیں نکاح کر لو۔ ایک وقت میں) دو دو۔ تین تین۔ چار چار تک کر سکتے ہو۔ (بشرطیکہ ان میں انصاف کر سکو یعنی سب کے حقوق ادا کر سکو اور سب کے ساتھ یکساں سلوک کر سکو) اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ انصاف نہیں کر سکو گے، تو پھر چاہئے کہ ایک بیوی سے زیادہ نہ کرو۔
>
> یا پھر جو عورتیں (لڑائی کی قیدیوں میں سے) تمہارے ہاتھ آگئی ہیں (انھیں بیوی بنا کر

رکھو) بے انصافی سے بچنے کے لئے ایسا کرنا زیادہ قرین صواب ہے (بہ نسبت اس کے کہ یتیم لڑکیوں کے حقوق کے لئے اللہ کے حضور جواب دہ ہو)۔

اسی کے ساتھ وہ اپنے تفسیری نوٹ میں تحریر فرماتے ہیں کہ

(۳) ضمناً نکاح کا حکم کہ اگر ایک مرد استطاعت رکھتا ہو اور چاہے کہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھے، تو چار تک رکھ سکتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ انصاف کرے۔ یعنی سب کے ساتھ یکساں سلوک کرے۔ اگر اندیشہ ہو کہ انصاف نہیں کر سکے گا، تو پھر ایک سے زیادہ نہیں کرنا چاہیئے۔

(ترجمان القرآن ص۳۲۹ جلد اول مطبوعہ دفتر ترجمان قرآن دہلی ۱۳۵۰ھ)

اسی آیت کریمہ کا ترجمہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ نے یوں فرمایا ہے کہ

اور اگر ڈرو کہ انصاف نہ کر سکو گے یتیم لڑکیوں کے حق میں تو نکاح کر لو جو اور عورتیں تم کو خوش آویں۔ دو دو۔ تین تین۔ چار چار۔ پھر اگر ڈرو کہ ان میں انصاف نہ کر سکو گے تو ایک ہی نکاح کرو یا لونڈی جو اپنا مال ہے۔

اس آیت کے تفسیری نوٹ میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں کہ

احادیث صحیحہ میں منقول ہے کہ یتیم لڑکیاں جو اپنے ولی کی تربیت میں ہوتی تھیں اور وہ لڑکی اس ولی کے مال اور باغ میں بوجہ قرابت باہمی شریک ہوتی تو اب دو صورتیں پیش آتیں۔ کبھی تو یہ ہوتا کہ ولی کو اس کا جمال اور مال دونوں مرغوب ہوتے تو وہ ولی اس سے تھوڑے سے مہر پر نکاح کر لیتا کیونکہ دوسرا شخص اس لڑکی کا حق مانگنے والا تو کوئی ہے ہی نہیں اور کبھی یہ ہوتا کہ یتیم لڑکی کی صورت تو مرغوب نہ ہوتی مگر ولی یہ خیال کرتا کہ دوسرے سے نکاح کر دوں گا تو لڑکی کا مال میرے قبضہ سے نکل جائے گا اور میرے مال میں دوسرا شریک ہو جاوے گا۔ اس مصلحت سے نکاح تو جوں توں کر لیتا مگر منکوحہ سے کچھ رغبت نہ رکھتا۔ اس پر یہ آیت اتری اور اولیا کو ارشاد ہوا کہ اگر تم کو اس بات کا ڈر ہے کہ تم یتیم لڑکیوں کی بابت انصاف نہ کر سکو گے اور ان کے مہر اور ان کے ساتھ حسن معاشرت میں

میں کوتاہی ہوگی تو تم ان سے نکاح مت کرو بلکہ اور عورتیں جو تم کو مرغوب ہوں ان سے ایک چھوڑ چار تک کی تم کو اجازت ہے۔ قاعدۂ شریعت کے مطابق ان سے نکاح کرلو تاکہ یتیم لڑکیوں کو بھی نقصان نہ پہنچے کیونکہ تم ان کے حقوق کے حامی رہوگے اور تم بھی کسی خرابی اور گناہ میں نہ پڑوگے۔ جاننا چاہئے کہ مسلمان آزاد کے لئے زیادہ سے زیادہ چار نکاح تک اور غلام کے لئے دو تک اجازت ہے اور حدیثوں میں بھی اسی کی تصریح ہے اور ائمۂ دین کا بھی اسی پر اجماع ہے اور تمام امت کے لئے بھی حکم ہے۔ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت اور آپ کا امتیاز ہے کہ اس سے زائد کی اجازت ہے۔

(ترجمۂ قرآن حضرت شیخ الہند ص۹۹ مطبوعہ مدینہ پریس بجنور ۱۳۵۵ھ)

ہم ان تراجم و تفاسیر کے متعلق کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ مولانا آزاد نے جو فرمایا ہے اور بین القوسین جس قدر عبارتیں اپنی طرف سے بڑھائی ہیں وہ ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے جس نے عبارت قرآنی کو ایسے معانی پہنا دئے ہیں جو اصل عبارت کے بالکل ہی الٹ ہیں۔ اگر بین القوسین اضافہ شدہ عبارتوں کو حذف کر دیا جائے تو اصل ترجمہ بنتا ہے۔

اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ یتیم لڑکیوں کے معاملہ میں انصاف نہ کرسکوگے تو جو عورتیں پسند آئیں۔ ان سے نکاح کرلو۔ دو دو۔ تین تین۔ چار چار تک کرسکتے ہو۔ اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ انصاف نہیں کرسکوگے، تو پھر چاہئے کہ ایک بیوی سے زیادہ نہ کرو۔

اس ترجمہ میں "تو جو عورتیں تمہیں پسند آئیں" کی جگہ "تو ان عورتوں میں سے جو تمہیں پسند آئیں" کے الفاظ رکھ دیجئے۔ کیونکہ ہم بتا چکے ہیں کہ النساء پر الف ولام ہونے کی وجہ سے نساءٌ سے عام اور غیر متعین و غیر مذکور عورتیں مراد نہیں ہوسکتیں بلکہ وہی عورتیں مراد ہوسکتی ہیں جو متعین ہیں اور جن کا تذکرہ ضمناً پہلے آچکا ہے۔ اس معمولی سی تبدیلی کے بعد غور فرمائیے کہ اس عبارت سے وہ مطلب نکالنا کہاں تک درست ہے جو مولانا آزاد نے نکالا ہے۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ بسا غنیمت ہے۔ لیکن اس میں بھی "جو اور عورتیں" کا لفظ قرآن کریم پر اضافہ ہے۔ قرآن کریم میں ایسا کوئی لفظ موجود نہیں ہے جس کا ترجمہ "اور" کے لفظ سے کیا جا سکے۔ صحیح ترجمہ "ان میں سے جو عورتیں" ہوگا۔ اس ذرا سی تبدیلی کے بعد آپ خود غور فرمائیں کہ قرآن کریم

کے یہ الفاظ اس پوری تفصیل پر جو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیری نوٹ میں درج فرمائی ہے کس طرح منطبق ہو سکتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اس میں نہ مولانا ابوالکلام آزاد کا کوئی قصور ہے اور نہ حضرت شیخ الہند رح کا اور نہ دیگر مفسرین و مترجمین کا۔ قصور اس اصول شکنی کا ہے جو اس سلسلہ میں سرزد ہو گئی ہے۔ تفسیر کا اصول یہ ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر شان نزول کی روایات سے نہیں کی جا سکتی۔ ارباب اصول نے یہ بات متفقہ طور پر طے کر دی ہے کہ اَلْعِبْرَۃُ لِعُمُوْمِ الْاَلْفَاظِ لَا لِخُصُوْصِ الْمُوْرِدِ۔ (اعتبار الفاظ کے عموم کا ہوتا ہے خصوصی شان نزول کا نہیں ہوتا)۔ لیکن یہ اصول نہ جانے کیوں یہاں نظر انداز ہو گیا ہے اور قرآن کریم کے الفاظ کو زبردستی کھینچ تان کر کے وہ معنی پہنانے کی کوشش کی جا رہی ہے جو شان نزول کے سلسلہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت سے سمجھ لئے گئے تھے۔ اس روایت پر ہم آئندہ چل کر کلام کریں گے۔ اور بتائیں گے کہ جو معانی اس روایت سے سمجھ لئے گئے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں۔ لیکن پہلے یہ دیکھ لیجئے کہ شانِ نزول کی روایات کی حیثیت کیا ہوتی ہے اور انھیں خود ارباب فن نے کیا اہمیت دی ہے۔ چنانچہ اس موضوع پر حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۱۷۶ھ) فرماتے ہیں کہ

وایضا من المواضع الصعبة معرفة اسباب النزول۔ ووجه الصعوبة فيها ايضا اختلاف المتقدمين والمتأخرين۔ والذی يظهر من استقراء كلام الصحابة والتابعين انهم لا يستعملون نزلت فی كذا، لمحض قصة كانت فی زمنه صلی الله عليه وسلم وهی سبب نزول الاية، بل ربما يذكرون بعض ما صدقت عليه

اور اسباب نزول کی دریافت بھی مشکل مقامات میں سے ہے۔ اس میں بھی دشواری کی وجہ وہی متقدمین اور متاخرین (کے درمیان اصطلاح) کا اختلاف ہے صحابہ اور تابعین کے کلام کے استقرائی مطالعہ سے جو بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ یہ ہے کہ وہ حضرات "یہ آیت فلاں واقعہ میں نازل ہوئی" کے الفاظ ہمیشہ محض اس مقصد کے لئے استعمال نہیں کرتے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پیش آیا ہو اور جو آیت کے نازل ہونے کا سبب ہو، بلکہ اکثر یہی الفاظ وہ بعض ان باتوں کے لئے بھی بیان کر دیتے ہیں جن پر یہ آیت صادق آسکتی ہو

الاية مما كان فى زمنه صلى الله عليه وسلم او بعده صلى الله عليه وسلم ويقولون: نزلت فى كذا ولا يلزم هناك انطباق جميع القيود، بل يكفى انطباق اصل الحكم فقط، وقد يقررون حادثة تحققت فى تلك الايام المباركة واستنبط صلى الله عليه وسلم حكمها من اية وتلاها فى ذلك الباب ويقولون نزلت فى كذا وربما يقولون فى هذه الصورة فانزل الله قوله كذا فكانه اشارة الى انه استنباطه صلى الله عليه وسلم، والقاؤها فى تلك الساعة بخاطره المبارك ايضا نوع من الوحى والنفث فى الروع، فلذلك يمكن ان يقال: فانزلت، ويمكن ايضا ان يعبر فى هذه الصورة بتكرار النزول، ويذكر المحدثون فى ذيل ايات القران كثيرا من الاشياء ليست من قسم سبب النزول فى الحقيقة، مثل استشهاد الصحابة فى مناظراتهم

وہ باتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہوئی ہوں یا آپ کے بعد ہوئی ہوں۔ ان باتوں کے لئے بھی وہ کہہ دیتے ہیں کہ "یہ آیت فلاں واقعہ میں نازل ہوئی تھی"۔ ایسی صورت میں تمام حدود و قیود کا منطبق ہونا ضروری نہیں ہوا کرتا بلکہ صرف اصل حکم کا منطبق ہوجانا بھی کافی سمجھا جاتا ہے کبھی کبھی وہ کسی واقعہ کو بیان کردیتے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ایام میں پیش آیا تھا اور آپ نے اس واقعہ کا حکم کسی قرآنی آیت سے استنباط فرما کر بیان فرمادیا اور اس موضوع سے متعلق آیت کی تلاوت بھی فرمادی صحابہ تابعین ایسی صورت میں بھی کہدیتے ہیں کہ "وہ آیت فلاں واقعہ میں نازل ہوئی تھی"۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ ایسی صورت میں یہ کہہ گزرتے ہیں کہ "حق تعالیٰ نے اس سلسلہ میں اپنا فلاں قول نازل فرمادیا" اس سے بھی غالباً اشارہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے استنباط ہی کی طرف ہوتا ہے کہ اس وقت آپ کے قلب مبارک میں وہ آیت ڈالدی گئی (کہ اس صورت کا حکم فلاں فلاں آیت سے نکالا جاسکتا ہے) یہ بھی ایک درجہ میں وحی اور القاء ہی کی صورت ہے۔ لہٰذا ایسے موقعوں پر یہ کہدینا ممکن ہے کہ "فلاں آیت اس واقعہ میں نازل ہوئی تھی" نیز یہ بھی ممکن ہے کہ ایسی صورت میں ان آیات کا دوبارہ نزول تسلیم کیا جائے۔ محدثین آیات قرآنیہ کے ضمن میں بہت سی چیزیں نقل کردیتے ہیں جو

بآية اوتلاوته تمثيلهم
بآية اوتلاوته صلى الله عليه
وسلم آية للاستشهاد فى
كلامه الشريف. اوبرواية حديث
وافق الآية فى اصل الغرض، اوتعيين
موضع النزول، اوتعيين اسماء المذكورين
بطريق الابهام، اوبيان طريق
التلفظ بكلمة قرآنية اوفضل
سور وآيات من القرآن اوصورة
امتثاله صلى الله عليه وسلم
بامرمن اوامر القرآن ونحوذلك
وليس شيئ من هذا فى الحقيقة
من اسباب النزول ولا يشترط
احاطة المفسر بهذه الاشياء ....

ومما يناسب عندى ان اذكر
فى الباب الخامس ما نقل البخارى و
الترمذى والحاكم فى تفاسيرهم
من اسباب النزول و توجيه
المشكل بسند جيد الى الصحابة
اوالى حضرته صلى الله عليه وسلم
بطريق التنقيح والاختصار لفائدتين:
الاولى ان حفظ هذا القدر
من الآثار لابد منه للمفسر

درحقیقت اسباب نزول کی قسم سے نہیں ہوتیں مثلاً صحابہ نے اپنے مناظروں اور مباحثوں میں کسی آیت سے استدلال کیا یا آیت تلاوت کردی جس سے مقصد اس آیت کو محض مثال میں پیش کرنا تھا یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کلام شریف میں بطور دلیل کے کوئی آیت تلاوت فرمادی تھی یا صحابہ نے کوئی حدیث نقل کردی تھی جو اصل غرض وغایت میں آیت قرآنی کے موافق تھی یا انھوں نے نزول آیت کا مقام متعین کردیا تھا یا ان ناموں کو متعین کردیا تھا جن کا ذکر مبہم طریقہ پر کسی آیت میں آیا ہو یا کسی قرآن کے لفظ کا طریقۂ تلفظ بیان کردیا تھا یا سورتوں اور آیتوں کی فضیلت بیان کردی تھی یا یہ بتادیا تھا کہ احکام قرآن میں سے کسی حکم کا امتثال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی صورت سے فرمایا تھا اور اسی قسم کی دوسری باتیں۔ ان میں سے کوئی بات بھی درحقیقت اسباب نزول میں سے نہیں ہوتی اور کسی مفسر کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ان سب باتوں کو یاد رکھے ....

میرے خیال میں یہ مناسب ہوگا کہ میں اس کتاب کے پانچویں باب میں تنقیح اور اختصار کے ساتھ وہ اسباب نزول کی روایات نقل کردوں جو امام بخاری امام ترمذی اور امام حاکم نے اپنی تفسیروں میں نقل فرمائی ہیں اور ان میں سے جو روایات مشکل ہیں ان کی توجیہ بیان کردوں۔ یہ روایات عمدہ سند کے ساتھ یا تو صحابہ تک

كمالا بد مما ذكرناه من شرح غريب القرآن . والاخرى ان يعلم ان اكثر اسباب النزول لا مدخل لها فى فهم معانى الآيات ، اللهم الا شيئ قليل من القصص يذكر فى هذه التفاسير الثلثة ، التى هى اصح التفاسير عند المحدثين ، واما افراط محمد بن اسحاق والواقدى والكلبى وماذكروا تحت كل اية من قصة فاكثره غير صحيح عند المحدثين ، وفى اسناده نظر ، ومن الخطأ البين ان يعد ذلك من شروط التفسير

الفوز الكبير فى اصول التفسير

(صـ ۲۷- ۲۸- ۳۱)

مطبوعہ نور محمد۔ اصح المطابع۔ کارخانہ تجارت کتب ۔ کراچی سنہ ۱۳۸۰ھ

پہنچتی ہیں یا خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہیں۔ اس سے دو فائدے ہوں گے۔ پہلا فائدہ تو یہ ہوگا کہ ان تھوڑے سے آثار کو یاد کر لینا ہر مفسر کے لئے ضروری ہے جیسا کہ ان تشریحات کو یاد کر لینا بھی ضروری ہے جو قرآن کریم کے غریب الفاظ کی تشریح کے سلسلہ میں ہم نے بیان کی ہیں۔ دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ اکثر اسباب نزول کے متعلق یہ بات معلوم ہو جائیگی کہ ان میں سے بیشتر کا آیات کے سمجھنے میں کچھ بھی تو دخل نہیں ہے۔ بجز بہت تھوڑے سے ان قصوں کے جو ان تینوں تفسیروں میں نقل کئے گئے ہیں جو محدثین کے نزدیک صحیح ترین تفسیریں شمار ہوتی ہیں۔ جہاں تک محمد ابن اسحٰق ، واقدی اور کلبی کی زیادتیوں کا تعلق ہے کہ انھوں نے ہر آیت کے ذیل میں کوئی نہ کوئی قصہ بیان کر دیا ہے تو ان میں سے زیادہ تر صحیح نہیں ہیں اور ان کی سندات محل نظر ہیں۔ اور بڑی ہی فاحش غلطی ہے اگر ان روایات کو جاننا تفسیر کی شرائط میں سے شمار کیا جائے۔

حضرت شاہ صاحب کی اس طویل بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اسباب نزول یا شان نزول کے سلسلہ میں دراصل متقدمین اور متاخرین کے درمیان اس اصطلاح کے مفہوم میں بڑا فرق ہے۔ حضرات متاخرین جس مفہوم میں ان الفاظ کو استعمال کرتے ہیں، حضرات صحابہ و تابعین کے دور میں یہ الفاظ اس مفہوم میں استعمال نہیں ہوتے تھے۔ لہذا شان نزول کی روایات کی وہ اہمیت نہیں سمجھنی چاہئے جو متاخرین نے اپنے ہاں متعین کر رکھی ہے۔ اس سلسلہ میں دشواری یہ ہے کہ ہم دلیل میں الفاظ تو حضرات صحابہ اور تابعین کے پیش کرتے ہیں اور ان کو معنے وہ پہنا دیتے ہیں جو ہم نے خود اپنے ہاں متعین کر رکھے ہیں۔ حالانکہ ہمیں ان حضرات کے الفاظ کا وہی مفہوم

لینا چاہیے جس میں وہ حضرات خود ان الفاظ کو استعمال کرنے کے عادی تھے نہ کہ اپنا خود ساختہ مفہوم۔

اس تمہید کے بعد آئیے اس حدیث پر غور کریں جو آیت زیر بحث کے شان نزول کے سلسلہ میں پیش کی جاتی ہے اور جس کی بنیاد پر آیت کا ترجمہ اور اس کی تفسیر میں وہ تصرفات کئے گئے ہیں جو آپ پہلے دیکھ چکے ہیں۔ وہ حدیث یہ ہے کہ

عائشه: سألها عروة عن قوله تعالى وان خفتم الا تقسطوا في اليتمى الى او ما ملكت ايمانكم قالت يا ابن اختي هذه اليتيمة تكون في حجر وليها فيرغب في جمالها ومالها ويريد ان ينتقص صداقها فنهوا عن نكاحهن الا ان يقسطوا لهن في اكمال الصداق وامروا بنكاح من سواهن قالت عائشة فاستفتى الناس رسول الله صلى الله عليه وسلم فانزل الله تعالى يستفتونك في النساء الى وترغبون ان تنكحوهن فبين لهم ان يتيمة اذا كانت ذات جمال ومال رغبوا في نكاحها ولم يلحقوها بسنتها في اكمال الصداق واذا كانت مرغوبة عنها في قلة المال والجمال تركوها والتمسوا غيرها

حضرت عائشہ رض کی روایت ہے کہ ان سے حضرت عروہؒ نے حق تعالیٰ کے قول وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی تا اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ کے متعلق دریافت کیا تو حضرت عائشہ رض نے فرمایا۔ بھانجے! یہ وہ یتیمہ ہے جو اپنے ولی کی تربیت میں ہوتی تھی۔ ولی کو اس کی خوبصورتی اور مال پسند آتا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ اس کا مہر کم کرکے اس سے نکاح کرے انھیں ان لڑکیوں سے نکاح کرنے سے روک دیا گیا مگر اس صورت میں کہ ان کا پورا پورا مہر ادا کرنے میں وہ انصاف سے کام لیں اور انھیں حکم دیا گیا کہ وہ ان کے علاوہ دوسری عورتوں سے نکاح کرلیں۔ حضرت عائشہ رض نے فرمایا کہ اس کے بعد لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شریعت کا حکم معلوم کیا تو حق تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی یَسْتَفْتُوْنَکَ فِی النِّسَآءِ تا وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْکِحُوْھُنَّ اور لوگوں کے لئے وضاحت فرما دی کہ یتیم لڑکی جب خوبصورت اور مالدار ہوتی ہے تو لوگ اس سے نکاح کرنے کی خواہش رکھتے ہیں مگر اس کا پورا مہر ادا کرنے میں کوتاہی کرتے

من النساء قال فكما تيركونها
حين يرغبون عنها فليس لهم
ان ينكحوها اذا رغبوا فيها الا
ان يقسطوا لها ويعطوها حقها
الاوفى من الصداق ؛

وفي رواية: يا ابن اختي هي
اليتيمة تكون في حجر وليها تشاركه
في ماله فيعجبه مالها وجمالها ويريد
ان يتزوجها بغير ان يقسط في
صداقها فيعطيها مثل ما يعطيها
غيره فنهوا عن نكاحهن الا
ان يقسطوا لهن ويبلغوا لهن
اعلى سنتهن من الصداق ؛

وفيه: قالت والذي ذكر الله
انه يتلى عليكم في الكتاب
الآية الاولى التي قال فيها وان
خفتم الا تقسطوا في اليتمى فانكحوا
ماطاب لكم قالت وهو قول الله
٦ تعالى في الآية الاخرى وترغبون ان
تنكحوهن رغبة احدكم عن
يتيمته التي تكون في حجره حين تكون
قليلة المال فنهوا ان ينكحوا ما رغبوا في
مالها وجمالها من يتامى النساء

ہیں) اور جتنا مہر اس کا ہونا چاہئے وہ اسے ادا نہیں کرتے اور جب اس کی دولت اور حسن میں کمی ہوتی ہے تو اس کی لوگوں کو رغبت نہیں ہوتی اور اُسے چھوڑ کر دوسری عورتیں تلاش کرتے ہیں۔ تو حق تعالیٰ نے فرمایا جس طرح وہ اُسے بے رغبتی کی صورت میں چھوڑ دیتے ہیں اسی طرح انھیں اس وقت بھی ان سے نکاح کرنے کا حق نہیں ہے جب انھیں ان کی طرف رغبت ہو مگر اس صورت میں کہ وہ ان کے لئے انصاف برتیں اور انھیں ان کے مہر کا پورا پورا حق ادا کریں۔

دوسری روایت میں ہے کہ بھانجے! یہ وہ یتیم لڑکی ہے جو اپنے ولی کی تربیت میں ہوتی تھی اور اس کے مال میں اس کی شریک ہوا کرتی تھی۔ ولی کو اس کا مال اور اس کی خوبصورتی پسند ہوتی تھی اور مہر کے سلسلہ میں انصاف برتے بغیر جو مہر اُسے دوسرے لوگ دے سکتے تھے اتنا ہی مہر وہ بھی دیدیتا۔ اس کے بغیر ہی وہ اس سے شادی کر لینا چاہتا تھا۔ لہٰذا ان لوگوں کو ان سے نکاح کرنے سے روک دیا گیا مگر اس صورت میں کہ وہ ان سے انصاف کا برتاؤ کریں اور وہ ان کے درجہ (STATUS) کے بلند ترین مہر تک پہنچ جائیں کہ اس درجہ کی خواتین کا بلند ترین مہر جو کچھ ہو سکتا ہو وہ ان کو ادا کریں۔

اسی روایت میں ہے کہ حضرت عائشہ رضؓ نے فرمایا کہ یہ جو حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ یتلیٰ علیکم فی الکتٰب (وہ آیت جو قرآن میں تلاوت کی جاتی ہے) اس سے مراد

الا بالقسط من اجل رغبتھم عنھن ÷ للشیخین وابی داؤد والنسائی
(جمع الفوائد من جامع الاصول ومجمع الزوائد، للامام محمد بن محمد ابن سلیمان المتوفی ۱۰۹۴ھ مطبوعہ مطبعۂ خیریہ ببلدۃ میرٹھ ۱۳۴۵ھ

پہلی آیت ہے جس میں حق تعالیٰ نے فرمایا ہے وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ
حضرت عائشہ رضؓ نے فرمایا اور وہی حق تعالیٰ کا قول ہے۔ دوسری آیت میں کہ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْکِحُوْھُنَّ یعنی جب لڑکی کم مالدار ہوتی ہے تو ولی کو جس کی تربیت میں وہ یتیم لڑکی ہوتی ہے اس سے بے رغبتی ہوتی ہے۔ لہٰذا ان کو ان یتیم عورتوں سے نکاح کرنے سے بھی روک دیا گیا جن کے مال اور خوبصورتی میں ان کو رغبت ہوا کرتی تھی مگر یہ کہ وہ انصاف کا برتاؤ کریں۔ اس لئے کہ انھیں ان لڑکیوں سے کوئی رغبت نہیں ہوتی تھی (بلکہ ان کے مال اور خوبصورتی سے رغبت ہوا کرتی تھی)۔

آپ نے ملاحظہ فرما لیا ہو گا کہ ان روایات میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہیں بھی اس بات کی طرف اشارہ نہیں فرمایا ہے کہ سورۂ نساء کی آیت نمبر ۳ یعنی وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی والی آیت کا سبب نزول یا شان نزول یتیم اور بیوہ عورتوں کے ساتھ اس قسم کی کوئی ناانصافی تھی کہ ان کے اولیاء کم مہر پر ان سے نکاح کر لیا کرتے تھے اور اس زیادتی کو روکنے کے لئے یہ آیت نازل ہوئی تھی بلکہ اس کے برعکس انھوں نے اس قسم کی ناانصافیوں کا تذکرہ فرمانے کے بعد صراحت کے ساتھ فَاسْتَفْتَی النَّاسُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاَنْزَلَ اللّٰہُ تَعَالٰی یَسْتَفْتُوْنَکَ فِی النِّسَاءِ اِلٰی وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْکِحُوْھُنَّ (تو لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شریعت کا حکم معلوم کیا تو حق تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی یَسْتَفْتُوْنَکَ فِی النِّسَاءِ تا وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْکِحُوْھُنَّ فرما کر یہ بتا دیا ہے کہ وہ دراصل اپنی اس روایت میں سورۂ نساء کی آیت نمبر ۱۲۷ کا شان نزول یا سبب نزول بیان فرما رہی ہیں۔

اس حدیث کا حاصل، جو کچھ میں سمجھ سکا ہوں، یہ ہے کہ مسلمان معاشرہ میں یتیم اور بیوہ عورتوں کا ایک مسئلہ موجود تھا اس کا حل پیش کرنے کے لئے حق تعالیٰ نے سورۂ نساء کی آیت نمبر ۳ نازل فرمائی

اور تعدد ازدواج کی اجازت دیکر لوگوں کو ہدایت فرمائی کہ وہ ان یتیم اور بیوہ عورتوں کے ساتھ نکاح کرکے انھیں اپنے خاندانوں کا جزو بنالیں تاکہ ان کے ساتھ عدل و انصاف کا برتاؤ ہوسکے چنانچہ جب اس آیت کے مطابق عمل درآمد شروع ہوا تو اس قسم کے واقعات بھی پیش آئے، اور یہ واقعات پیش آنے بالکل قدرتی تھے، کیونکہ معاشرہ میں بہرحال ہر ذہنیت اور ہر رجحان کے لوگ ہوتے ہیں، کہ اگر کوئی یتیم اور بیوہ عورت حسین اور مالدار ہوتی تو اس سے خود نکاح کرنے سے کتراتے اور دوسری عورتیں نکاح کرنے کے لئے تلاش کرتے تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں جب اس قسم کے واقعات لائے گئے تو آپ نے لوگوں کو اس سے منع فرمادیا اور حکم صادر فرمادیا کہ کوئی ولی اپنی زیر تربیت اور زیر کفالت یتیم اور بیوہ خاتون سے نکاح نہ کرے۔ کیونکہ ایسا کرنے میں ان یتیم اور بیوہ خواتین کی حق تلفی ہورہی تھی اور یہ بات حکم خداوندی کے منشاء اور اس کی روح کے قطعاً خلاف تھی۔ ان یتیم اور بیوہ خواتین کو حبالۂ عقد میں لانے کی اجازت تو اس لئے دی گئی تھی کہ ان کے ساتھ عدل و انصاف کا سلوک ہوسکے اور ان کے حقوق کی حفاظت و صیانت کی جاسکے۔ لیکن جب کچھ لوگوں نے اس حکم الٰہی کو بجائے ان عورتوں کی حفاظت و پاسداری کرنے کے ان کے حقوق غصب کرنے اور ان پر ظلم کرنے کا ذریعہ بنالیا تو اس حکم میں تھوڑی ترمیم کردی گئی۔ لہٰذا یہ حکم دیا گیا کہ اولیاء کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ خود اپنی زیر کفالت خواتین سے شادیاں کریں۔ لوگوں کو ایسی یتیم اور بیوہ خواتین سے شادیاں کرنی چاہئیں جو خود ان کے زیر کفالت اور زیر تربیت نہ ہوں۔ زید ان خواتین سے شادی کرے جو زید کی زیر کفالت و تربیت ہوں اور عمر ان خواتین سے شادی کرے جو بکر کی کفالت و تربیت میں ہوں تاکہ ان خواتین کے حقوق کی کماحقہ حفاظت ہوسکے اور ان کے ساتھ عدل و قسط کا سلوک کیا جاسکے۔ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا اجتہادی فیصلہ تھا اور خود سورۂ نساء کی آیت نمبر ۳ ہی سے مستنبط تھا اور حرف بحرف درست تھا کیونکہ منشائے ربانی بھی اس آیت سے یہی تھا کہ ان خواتین کے ساتھ عدل و قسط کا سلوک کیا جائے۔ منشائے ربانی قطعاً یہ نہیں تھا کہ اس حکم یا اجازت سے ان خواتین کی مزید حق تلفی کی جائے۔ اس بات کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان الفاظ سے بیان فرمایا ہے کہ

تَنْهَوْا عَنْ نِكَاحِهِنَّ إِلَّا أَنْ يُقْسِطُوا لَهُنَّ فِي إِكْمَالِ الصَّدَاقِ وَأُمِرُوا بِنِكَاحِ مَنْ سِوَاهُنَّ (تو لوگوں کو ان یتیم اور بیوہ عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے سے روک دیا گیا مگر اس صورت میں کہ وہ ان کا پورا پورا مہر ادا کرنے میں ان کے ساتھ انصاف کا سلوک کریں اور انھیں حکم دیا گیا کہ وہ ان کے علاوہ

دوسری عورتوں سے (جو اُن کے زیر کفالت نہ ہوں) شادی کر سکتے ہیں۔ یہاں حضرت عائشہ رضؓ نے نُهُوْا اور اُمِرُوْا کو بصیغہ مجہول استعمال فرمایا ہے۔ یعنی یہ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ ان دونوں فعلوں کا فاعل کون ہے۔ حضرت عائشہ رضؓ نے قطعاً ایسا کوئی اشارہ نہیں فرمایا کہ یہ ممانعت حق تعالیٰ نے آیت نمبر ۳ سے فرمائی تھی یا آیت نمبر ۳ سے حق تعالیٰ نے لوگوں کو ایسا کوئی حکم دیا تھا جس کی بنا پر ان واقعات کو اس آیۃ کا شان نزول قرار دیا جاسکے۔ بلکہ اس کے برعکس اس کا قرینہ موجود ہے کہ ان دونوں فعلوں کے فاعل جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھے نہ کہ ذات خداوندی۔ یعنی یہ ممانعت خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے فرمائی تھی اور دوسری خواتین کے ساتھ نکاح کرنے کی ہدایت بھی آنحضور صلی علیہ وسلم ہی نے دی تھی۔ اس قرینہ کو ہم بعد میں بیان کریں گے۔

حدیث کے انداز بیان سے ایسا نظر آتا ہے کہ یہ ممانعت بھی مختلف مراحل سے گذری تھی۔ ابتداً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یتیم اور بیوہ عورتوں کے اولیا کو قطعاً منع فرمادیا ہوگا کہ وہ کسی صورت میں بھی اپنی زیر کفالت و قرابت خواتین سے شادیاں نہ کریں۔ اس کے بعد دوسرے مرحلہ میں جب آپ نے محسوس فرمالیا ہوگا کہ اس عمل درآمد کی برائی اور قباحت بڑی حد تک لوگوں کے ذہن نشین ہوچکی ہے جس کے تدارک کے لئے وہ ممانعت کی گئی تھی تو آپ نے اس بالکلیہ ممانعت کی طنابیں کچھ ڈھیلی کردی ہوں گی اور لوگوں کو ان خواتین کے ساتھ شادیاں کرلینے کی اجازت اس شرط کے ساتھ دیدی ہوگی کہ انہیں وہ زیادہ سے زیادہ مہر ادا کیا جائے جو ان کا ہوسکتا ہو۔ تاکہ اس بات کا اچھی طرح اطمینان ہوجائے کہ شادیاں کرنے والوں کی نیت میں ان خواتین کی حق تلفی کرنے کا ادنیٰ شائبہ بھی موجود نہیں ہے۔ اسی بات کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے ان الفاظ سے بیان فرمایا ہے کہ اَلَّا اَنْ یُّقْسِطُوْا لَهَا وَیُعْطُوْهَا حَقَّهَا الْاَوْفٰی مِنَ الصَّدَاقِ (مگر یہ کہ وہ ان کے ساتھ انصاف کا سلوک کریں اور انہیں ان کے مہر کا مکمل ترین (حَقَّهَا الْاَوْفٰی) ادا کریں) اور اسی بات کو دوسری مرتبہ ان الفاظ سے واضح فرمایا ہے کہ اِلَّا اَنْ یُّقْسِطُوْا لَهُنَّ وَیَبْلُغُوْا بِهِنَّ اَعْلٰی سُنَّتِهِنَّ مِنَ الصَّدَاقِ (مگر یہ کہ وہ ان کے ساتھ انصاف کا سلوک کریں اور ان کے لئے ان کے درجہ (STATUS) کے مطابق بلندترین مہر تک پہنچ جائیں کہ ان کے درجہ کی خواتین کا جو بلندترین مہر ہوسکتا ہو وہ ان کو ادا کریں)۔

اس قسم کے سخت قوانین ہمیشہ ہنگامی ہوا کرتے ہیں اور وقتی مصالح کو پورا کرنے کے لئے نافذ کئے جاتے ہیں۔ اور جب یہ وقتی مصلحتیں اور ضرورتیں پوری ہوجاتی ہیں تو ان کو واپس لے لیا جاتا ہے۔ اس قسم

کے سخت ہنگامی قوانین سے عام لوگوں کو دشواریاں بھی پیش آتی ہیں، خصوصاً ان لوگوں کو جن کی نیتوں میں کوئی قصور نہیں ہوتا۔ یہی کچھ اس قانون کے سلسلہ میں بھی ہوا ہوگا۔ اور لوگوں نے آپ کو اطمینان دلاتے ہوئے کہ آئندہ ایسی کوئی صورت پیش نہیں آئیگی جس سے ان خواتین کی کوئی حق تلفی کا اندیشہ ہو درخواست کی ہوگی کہ اس قانون میں نرمی فرمائی جائے۔ چنانچہ اس کے بعد آیت نمبر ۲۴ نازل ہوئی اور اس حکم میں اتنی نرمی اور فرمادی گئی کہ زیادہ سے زیادہ۔ بلند ترین اور مکمل ترین مہر ادا کرنے کی پابندی نہیں رکھی گئی بلکہ محض عدل و قسط کا دامن مضبوطی سے تھامے رہنے کی تاکید فرمائی گئی۔ یعنی انصاف کی رو سے جس قدر ان کا مناسب مہر ہونا چاہیئے اتنا مہر ان کو ادا کر دینے کے بعد ان کے ساتھ نکاح کرنے کی اجازت دیدی گئی۔

حدیث مذکورہ بالا پر ایک مرتبہ اور نظر ڈال لیجئے اور اس کے بعد سورۂ نساء کی ان دونوں آیات کریمہ پر بھی دوبارہ غور فرمایئے اور دیکھئے کہ آیت نمبر ۳ کا یہ منشاء ہرگز نہیں تھا کہ لوگ چونکہ ان یتیم اور بیوہ عورتوں سے جو ان کے زیر تربیت و کفالت ہوا کرتی تھیں چونکہ کم مہر پر شادیاں کر لیتے تھے اور انھیں ان کا پورا حق مہر ادا نہیں کرتے تھے لہٰذا اس بدعملی کو روکنے کے لئے یہ آیت نازل فرمائی گئی ہو اور ان سے کہا گیا ہو کہ وہ ان یتیم اور بیوہ عورتوں کے بجائے دوسری عورتوں سے شادیاں کریں۔ جیسا کہ عام طور پر سمجھ لیا گیا ہے۔ کیونکہ اگر آیت نمبر ۳ واقعی اسی سلسلہ میں نازل ہوئی ہوتی اور حضرت عائشہ رضؓ کی اس حدیث میں نُھُوْ اور اُمِرُوْا کے الفاظ سے حضرت عائشہ رضؓ کا مقصد یہ ہوتا کہ لوگوں کو ان خواتین کے ساتھ نکاح کرنے کی ممانعت اور دوسری عورتوں سے نکاح کرنے کی ہدایت اسی آیت نمبر ۳ سے فرمائی گئی تھی۔ اور یوں یہ ممانعت اور ہدایت خود اللہ تعالیٰ نے فرمائی تھی تو واقعات کی کڑیاں درست نہیں بیٹھتیں۔ آپ نے حضرت عائشہ رضؓ کی حدیث میں دیکھا ہے کہ حضرت عائشہ رضؓ کے بیان کے مطابق یہ استثناء آیت نمبر ۳ کی ممانعت کے ساتھ بھی موجود تھا کہ اگر ان خواتین کو ان کا پورا پورا مہر ادا کرنے میں عدل و قسط سے کام لیں تو وہ ان سے نکاح کر سکتے ہیں۔ فَنُھُوْا عَنْ نِّکَاحِھِنَّ اِلَّآ اَنْ یُّقْسِطُوْا لَھُنَّ فِیْ اِکْمَالِ الصَّدَاقِ (چنانچہ لوگوں کو ان کے ساتھ نکاح کرنے سے روک دیا گیا مگر یہ کہ وہ ان کے لئے مہر کو پورا کرنے میں عدل و قسط سے کام لیں) یعنی اس آیت کی رو سے بالکلیہ بندش نہیں لگائی گئی تھی بلکہ بندش محض اس صورت میں تھی کہ اگر لوگ ان خواتین کو پورا پورا مہر ادا نہ کریں تو وہ ان سے شادیاں نہ کریں بلکہ دوسری عورتوں سے شادیاں کریں اور اگر وہ ان کو ان کا پورا مہر ادا کر دیں تو پھر وہ خود ان خواتین سے بھی شادیاں کر سکتے ہیں۔ لیکن لوگوں نے

اس حکم میں دشواری محسوس کی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت بابرکت میں خدا کا حکم معلوم کرنے کے لئے فتوے طلب کرنے شروع کر دئے۔ اور اس کے نتیجہ میں حق تعالیٰ نے آیت نمبر ۱۲۷ نازل فرمائی اور پہلے حکم ہی کی پھر تکرار فرما دی گئی چنانچہ حضرت عائشہ رضؓ کے بیان کے مطابق وہی استثناء پھر دے دیا گیا کہ اِلَّا اَنْ یُّقْسِطُوْا لَھَا وَیُعْطُوْھَا حَقَّھَا الْاَوْفٰی مِنَ الصَّدَاقِ (مگر یہ کہ وہ ان کے لئے عدل و قسط کا برتاؤ کریں اور انھیں ان کے مہر کا مکمل ترین حق ادا کر دیں) پہلے بھی عدل و قسط کے ساتھ ان سے نکاح کر لینے کی اجازت تھی اور اب بھی وہی اجازت اَلْاَوْفٰی (مکمل ترین) کی قید کے ساتھ بحال رکھی گئی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسی تبدیلی عمل میں آئی تھی جس کی وجہ سے حق تعالیٰ کو یہ دوسری آیت نازل فرمانی پڑی۔ جو حکم اس آیت نمبر ۱۲۷ سے دیا گیا ہے، اس حکم کے لئے تو پہلی آیت نمبر ۳ ہی کافی تھی۔ اس توجیہ کے مطابق آیت نمبر ۱۲۷ نے قطعاً کوئی نیا فائدہ نہیں دیا۔ بلکہ اُسی حکم کو دہرا دیا گیا ہے جو آیت نمبر ۳ میں دیا گیا تھا۔ اسی لئے ہم نے کہا تھا کہ نُھُوْا اور اُمِرُوْا سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مراد یہ نہیں ہے کہ یہ امر اور نہی آیت نمبر ۳ سے حاصل ہوئے تھے۔ دراصل یہی اس بات کا قرینہ ہے کہ ممانعت کرنے والی اور حکم دینے والی ہستی حضرت عائشہ رضؓ کی روایت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے، حق تعالیٰ کی ذات نہیں ہے۔ یہ ممانعت آپ نے آیت نمبر ۳ کی روح اور منشاء کو سامنے رکھ کر خود اپنے اجتہاد سے دی تھی۔ کیونکہ اس حکم کا منشاء یتامیٰ کے حقوق کی حفاظت اور پاسداری تھا۔ ان کو غصب کرنا نہیں تھا۔ جب خود اسی حکم سے یتامیٰ کے حقوق غصب کرنے کا کام لیا جانے لگا تو اس میں اتنی ترمیم ضروری ہو گئی کہ تعدد ازدواج کی اجازت تو ہے۔ لوگوں کو یتیم اور بیوہ عورتوں سے شادیاں بھی کرنی چاہئیں۔ لیکن ایسی بیوہ اور یتیم عورتوں سے شادیاں نہیں کرنی چاہئیں جو خود ان کی اپنی کفالت اور تربیت میں ہوں بلکہ ان سے شادیاں کرنی چاہئیں جو دوسرے لوگوں کی کفالت اور تربیت میں ہوں۔

اس ساری تفصیل سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آگئی ہوگی کہ اول تو یہ بات ہی صحیح نہیں ہے کہ سبب نزول یا شان نزول کی روایات کو اس قدر اہمیت دی جائے کہ قرآن کریم کی کسی آیت کو اس کے شان نزول پر فٹ کرنے کے لئے اس میں اس قسم کے ناپسندیدہ اضافات اور تصرفات کئے جائیں جیسا کہ قرآن کریم کی اس آیت (۱۲۷) میں کئے گئے ہیں۔ پھر آپ یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ حضرات صحابہ اور تابعین

رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دور میں شان نزول کا وہ مطلب نہیں ہوا کرتا تھا۔ جو بعد میں علمائے متأخرین کے ہاں متعارف ہوتا چلا گیا ہے۔ ان حضرات کے نزدیک شان نزول کا مطلب صرف اتنا ہی ہوا کرتا تھا کہ وہ مثال کے طور پر کسی ایک واقعہ کو بیان کر دیتے تھے جس پر وہ آیت صادق آسکتی ہو اور اس کا حکم منطبق ہوسکتا ہو تاکہ سننے والے کو آیت کا مطلب سمجھنے میں کسی قدر سہولت ہوجائے۔ وہ بسا اوقات ایسے واقعات کو بھی شان نزول ہی کی حیثیت سے بیان کر دیتے تھے، جن کا اس آیت کے نزول سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا البتہ جب کوئی واقعہ پیش آتا اور صحابہ میں سے کوئی صحابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا شرعی حکم معلوم کرتا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کسی قرآنی آیت سے استنباط فرما کر اس کا حکم بتلاتے اور دلیل میں وہ آیت بھی تلاوت فرما دیتے جس سے آپ نے وہ حکم استنباط فرمایا تھا تو حضرات صحابہ اس واقعہ کو بھی شان نزول ہی کی حیثیت سے بیان کر دیتے تھے اور ان کا مطلب اس سے بھی صرف اتنا ہی ہوتا تھا کہ اس مثال کو سامنے رکھ کر لوگ اس آیت کریمہ کے مضمرات کو سہولت کے ساتھ سمجھ سکیں کہ یہ آیت کس نوعیت کے واقعات پر منطبق ہوسکتی ہے۔ لہذا کسی شان نزول کی روایت کو پیش کر کے قرآنی آیت کو یوں جکڑ بند کرنا درست نہیں ہے جیسا کہ سورۂ نساء کی آیت نمبر ۳ کے سلسلہ میں ہمارے مترجمین و مفسرین نے کیا ہے۔

اس کے بعد آپ نے یہ بھی دیکھ لیا ہے کہ حضرت عائشہ رضؓ کی جس شان نزول والی روایت کی بناء پر آیت میں وہ بیجا تصرفات فرمائے گئے تھے، وہ روایت بھی سورۂ نساء کی آیت نمبر ۳ کا شان نزول بیان نہیں کررہی ہے۔ بلکہ آیت نمبر ۱۲۷ کا شان نزول بیان کررہی ہے۔ نیز اس روایت میں نُھُوْا اور اُمِرُوْا سے یہ مراد نہیں ہے کہ یہ نہی (ممانعت) اور امر (حکم) آیت نمبر ۳ سے حاصل ہوا تھا، جیسا کہ عام طور پر سمجھ لیا گیا ہے۔ بلکہ اس سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ سورۂ نساء کی پہلی آیت کے نازل ہونے کے بعد جب اس قسم کی زیادتیاں ہونے لگیں کہ لوگ ان یتیم اور بیوہ عورتوں سے جو خود ان کی کفالت اور تربیت میں ہوتی تھیں، اگر وہ خوبصورت اور مالدار ہوتیں، تو کم سے کم مہر پر ان سے خود نکاح کر لیتے اور اگر وہ خوبصورت اور مالدار نہ ہوتیں تو ان کی طرف وہ کوئی توجہ نہ کرتے بلکہ ایسی صورت میں وہ دوسری عورتوں کو تلاش کرتے پھرتے تھے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں اس قسم کے

واقعات آئے تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی لوگوں کو ایسا کرنے سے منع فرما دیا۔ کیونکہ ایسا کرنا دراصل خود اس حکم کی روح اور اس کے منشاء کے خلاف تھا جو سورۂ نساء کی آیت نمبر ۳ سے دیا گیا تھا۔

لہٰذا اس روایت میں کوئی ایسی چیز بیان نہیں ہوئی ہے جس کی وجہ سے ہمیں آیت کا منشاء اور مطلب متعین کرنے میں اپنی طرف سے ایسے الفاظ بڑھانے پر مجبور ہونا پڑے جو خود قرآن کریم کی اس آیت کریمہ میں موجود نہیں ہیں۔ اس لئے اس آیت کی تفسیر اور ترجمہ میں جو "دوسری عورتوں" یا اور عورتوں" کے الفاظ کا اضافہ کیا گیا ہے وہ قطعاً غیر ضروری بلکہ نامناسب اور ناپسندیدہ ہے۔ اس آیت کریمہ کا مطلب اتنا ہی ہے کہ اگر معاشرہ میں چھوٹے چھوٹے یتیم بچے اور بچیاں، نابالغ یتیم جوان لڑکیاں اور بیوہ عورتیں اس انداز سے پائی جاتی ہوں کہ بجز اس صورت کے کہ ان میں سے شادی کے لائق یتیم لڑکیوں اور بیوہ عورتوں سے شادیاں کر کے تم انھیں اپنے گھرانے کا ایک فرد بنا لو کسی اور طرح ان کے ساتھ سماجی اور معاشرتی عدل و انصاف کا سلوک نہ ہو سکتا ہو تو تمہیں اس کی اجازت ہے کہ ان میں سے جو تمہیں پسند ہوں اور جو تمہارے لئے حلال ہوں تم ان سے شادیاں کر لو۔ یہ شادیاں دو دو۔ تین تین۔ چار چار کی تعداد میں کی جا سکتی ہیں، بشرطیکہ ان متعدد بیویوں کے ساتھ تم برابری کا سلوک کر سکو اور کسی کی حق تلفی نہ کرو۔ لیکن اگر تمہیں اس کا اندیشہ ہو کہ تم ان کے ساتھ برابری کا سلوک نہیں کر سکو گے تو پھر تعدد ازدواج کی اجازت نہیں ہے۔ ایسی صورت میں تمہیں ایک ہی بیوی پر اکتفاء کرنا چاہیئے۔

(باقی آئندہ)